© rasailojaraid.com

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

اسلامی تہذیب اور تمدن کو کیوں کر ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟

— ۲ —

اسلامی تہذیب اور مغربی تمدن[1]

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اسلام موجودہ تہذیبی بحران اور اس کی اصلاح کے لیے کیا علاج تجویز کرتا ہے؟

---

[1] اس موقع پر یہ حقیقت خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ تہذیب و تمدن کے الفاظ وسیع معنی و مفہوم رکھتے ہیں، اور ان دونوں میں کافی فرق بھی پایا جاتا ہے۔ مگر عام طور پر بلا تکلف ایک کی جگہ پر دوسرا لفظ بول دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ان کے حدود اور مفہوم کے تعین میں سخت دشواری پیش آتی ہے اور مختلف ماہرین ان کی تشریح مختلف انداز سے کرتے ہیں۔ مگر جیسا کہ پچھلے مباحث سے ظاہر ہو گیا، تمدن سے میری مراد کوئی "مکمل نظام تمدن" نہیں بلکہ صرف اس کا وہ حصہ مراد ہے جو جدید علوم و فنون کے تعلق سے ظاہر ہوا ہو۔ اسی طرح تہذیب سے مراد میرے نزدیک کسی دین یا مذہب کا پورا سلسلۂ ایمانیات، نظامِ اخلاق و معاشرت اور اس کا پورا فکر و فلسفہ ہے۔ اسلامی تہذیب سے میری مراد اسی قسم کی مکمل تہذیب ہے جو ایک مکمل نظام زندگی پر مشتمل ہے اور میں نے جہاں کہیں بھی اپنی عبارت میں "اسلامی تہذیب" کا نام لیا ہے وہ اسی معنی و مفہوم میں ہے۔

اب اسلامی تہذیب اور تمدن جدید میں عقلی و منطقی حیثیت سے تعلق یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اصل اور بہر حال ہمیں برتر و فائق تر اور مطلوب و مقصود رہے گی۔ لیکن اس کے برعکس تمدنِ جدید اگرچہ اصلاً مطلوب و مقصود تو نہیں ہے مگر اسلامی تہذیب کے تحفظ اور اس کے استحکام کے لیے ایک ضمیمہ، وسیلہ اور آلۂ کار کی حیثیت سے اس کی بے انتہا اہمیت ہے اور کسی بھی دور میں اس کی اس اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگرچہ یہ مسئلہ بہت زیادہ تفصیل طلب ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنے کے لیے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے، لیکن یہاں محض چند اصول و کلیات پر اکتفا کیا جاتا ہے، تاکہ اس مقالے کے پچھلے تمام مباحث کا جو منطقی تقاضا ہے وہ کھل کر سامنے آجائے اور یہ بحث مکمل ہو جائے۔

اس سلسلے میں عصر جدید کے بہت سے مفکرین اور دانشور طبقے کی سنجیدہ رائے یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور جدید تمدن کے صالح عناصر کی یک جائی اور ان کے اجتماع ہی میں اہل اسلام اور عالم انسانی کا بھلا ہو سکتا ہے۔ یعنی ہم کسی قوم یا ملت سے اس کے تہذیبی نظریات مستعار لیے بغیر محض اس کے تمدنی عناصر کو ــــ جدید علوم و فنون وغیرہ کے روپ میں ــــ لے لیں اور خود اپنی برتر تہذیب ــــ شرعی و اخلاقی سرمایہ ــــ اور اس کے ابدی و عالم گیر نظریات اس کے حوالے کر دیں۔

جیسا کہ گزشتہ سطور سے ظاہر ہو گیا اس وقت ہمارے سامنے دو ہی اہم ترین مسائل ہیں جنھیں حل کیے بغیر ہم خلافت ارضی کے میدان کو سر نہیں کر سکتے۔ پہلا یہ کہ ہمیں مادی میدان میں قوت و طاقت حاصل کرنا اور اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کی کوشش کرنی ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ نوع انسانی کی صحیح رہنمائی کر کے اس کو موجودہ تباہی و بربادی کے غار سے نکالنا ہے، اس کے نظریات اور مادی فلسفوں کی اصلاح کرنی ہے، اس کے دماغ سے خدا بیزاری کے جراثیم نکال کر خدا پرستی کے صالح عناصر داخل کرنے ہیں اور اس کے تمام تہذیبی دکھوں کا مداوا کرنا ہے۔

اب یہ دونوں مقاصد اس طرح حل ہو سکتے ہیں کہ پہلے مسئلے کو حل کرنے کے باب میں اس وقت ہم خود مغرب کے محتاج ہیں، لہٰذا ہم کو وہ تمام علوم و فنون اور سارے تمدنی لوازم لینے ضروری ہیں، جن میں خیر کا پہلو غالب ہو اور جن کے بغیر موجودہ اجتماعی زندگی مشکل نظر آتی ہو۔ دوسرے مسئلے میں مغرب خود ہمارا محتاج ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس ایک اعلیٰ و ارفع خدائی ہدایت (اپنی محفوظ ترین شکل میں) اور کامل ترین تہذیب موجود ہے۔ لہٰذا تبادلے کے اصول کے مطابق ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی تہذیب ــــ اپنا دینی و اخلاقی سرمایہ ــــ اس کے حوالے کر کے اس کے تمدنی علوم و فنون کے سرمائے کو خود لے لیں۔ اس میں نہ صرف دونوں کا بھلا ہے بلکہ اسی میں فلاحِ انسانیت بھی مضمر ہے۔ (مگر پہل ہم ہی کو کرنی چاہیے)۔ یہ علوم و فنون بھی دراصل ان کے اپنے اور ذاتی نہیں بلکہ ہمارے ہی آبا و اجداد کی وراثت ہیں جن کو موجودہ مغربی قوموں نے قرونِ وسطیٰ میں ہم ہی سے لیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ اور بات ہے کہ انھوں نے ان علوم و فنون کو بے انتہا ترقی دے دی ہے، مگر نیو اور بنیاد ہماری ہی ڈالی ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارا موجودہ مغربی علوم و فنون کو اپنانا گویا کہ مغربی اقوام کا زیرِ بارِ احسان ہونا نہیں بلکہ درحقیقت ہماری ہی ملی و آبائی امانت کو واپس لے لینا ہے۔

ایک دوسری حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ بھی ایک حقیقت ہوگی کہ ہمارے آبا و اجداد نے قرونِ وسطیٰ میں مغربی قوموں کو علوم و فنون سے روشناس کرا کے ان پر ایک بہت بڑا احسان کیا تھا، اور اب تہذیبی اعتبار سے بھی ان کی رہنمائی کر کے ہم پھر دوبارہ ان پر احسان کرنے والے ہوں گے۔ اگر قرونِ وسطیٰ ہی میں اقوامِ مغرب ہمارے علوم و فنون کے ساتھ ہی ساتھ ہمارا تہذیبی سرمایہ بھی لے چکی ہوتیں تو موجودہ مغربی تہذیب کی گراوٹ، انارکی اور خدا فراموشی کا وہ حال نہ ہوتا جو آج نظر آ رہا ہے۔ بہرحال اسلامی تہذیب ہی ایک برتر تہذیب اور عالمِ انسانی کے لیے خیر و برکت کا باعث ہوگی، جو ہر حیثیت سے اونچ نیچ سے عاری اور صالح و متوازن ہے۔ جب تک اس تہذیب کا بول بالا نہیں ہوتا دنیا سے سیاست و معیشت کی ہوسناکی و خود غرضی اور معاشرتی و اجتماعی مفاسد کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا اسلام کی نظر میں اس مسئلے کا سب سے بہترین حل یہ ہے کہ اہلِ اسلام اپنے "خیرِ امت" ہونے کی حیثیت سے عالمِ انسانی کو "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کے اسباق پھر سے پڑھائیں اور اس کے سامنے اسلام کی دعوت اور اس کی خوبیوں کو واضح اور مثبت انداز میں پیش کریں۔ یہ اُن کے ذمے ایک دینی و شرعی فریضہ ہے جو ایک فرضِ کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے زندگی کے —— ملی و انسانی ہونے کی حیثیت سے —— دو ہی راستے ہیں: ایک یہ کہ ہم فوجی و عسکری طاقت میں مغربی ممالک کی برابری کر کے طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے، موجودہ تمام تہذیبی و تمدنی خرابیوں کو دور کرنے اور جدید معاشرے کو پوری طرح قابو میں رکھنے کی کوشش کریں۔ یا پھر ان قوموں کو حلقہ بگوش اسلام کر لیں جس کے باعث یہ غلط اور مضر تمدنی و اجتماعی رجحانات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اصلاح کی کوئی تیسری شکل ممکن نہیں ہے۔ مگر ہماری پیش رفت ان دونوں میدانوں میں بیک وقت ہونی چاہیے، ہم کسی ایک چیز کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے، ورنہ کامیابی مشکل ہوگی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تہذیب و تمدن کا اجتماع مفکرین کی نظر میں

یہ گویا کہ پیش پا افتادہ تمام مسائل و مشکلات کا حل ہے اور اس سلسلے میں جو بھی سمجھدار آدمی کھلے ذہن و دماغ کے ساتھ غور کرے گا تو عقلی و منطقی حیثیت سے اس کی راہ یابی اسی نتیجے اور اسی بنیادی نقطے کی طرف ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم دانش وروں کا طبقہ پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ ان دونوں چیزوں —— اسلامی تہذیب اور تمدنِ جدید یا جدید تمدنی علوم و فنون —— کو ملانے اور ان کے اجتماع سے نئے برگ و بار پیدا کرنے کا قائل اور اس کو وقت کی ناگزیر ضرورت سمجھتے ہوئے اس کا پرزور داعی و نقیب ہے۔ مثلاً مشہور صاحبِ فکر یوروپین مسلم علامہ محمد اسد جن کا علمی حلقوں میں بہت احترام پایا جاتا ہے، تحریر کرتے ہیں،

"علم نہ مغربی ہے نہ مشرقی، علمی انکشافات و تحقیقات ایک ایسے سلسلے کی کڑی ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں، اور جس میں تمام بنی نوع انسان برابر کے شریک ہیں۔ ہر عالم اور سائنٹسٹ ان ہی بنیادوں پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھتا ہے جو اس کے پیش روؤں نے قائم کی تھیں، خواہ وہ اس کی قوم سے تعلق رکھتے ہوں یا کسی اور قوم سے۔ اسی طرح ایک انسان سے دوسرے انسان، ایک نسل سے دوسری نسل، ایک تہذیب سے دوسری تہذیب تک تعمیر و اصلاح و ترقی کا کام برابر جاری رہتا ہے۔ اس لیے کہ اگر کسی خاص زمانے یا خاص تمدن میں یہ کام انجام پائیں تو یہ قطعاً نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس زمانے یا تہذیب کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اور زمانے میں کوئی دوسری قوم جو زیادہ باہمت اور حوصلہ مند ہو، میدان علم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ لیکن بہرحال سب اس کام میں برابر کے حصہ دار ہیں۔

"ایک دور ایسا بھی آیا تھا جب مسلمانوں کا تہذیب و تمدن یورپ کے تہذیب و تمدن سے زیادہ شاندار تھا۔ اس نے یورپ کو بہت سی انقلابی قسم کی صنعتی و فنی ایجادات عطا کیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے یورپ کو عملی طریقے کے اصول و مبادی دیے جس پر علمِ جدید اور تہذیب جدید کی بنیاد ہے، لیکن اس کے باوجود جابر بن حیان کا کیمسٹری کا علم عربی نہیں کہلایا۔ اسی طرح الجبرا اور علم مثلثات کو اسلامی علوم نہیں کہا گیا، حالانکہ اول الذکر کا موجد خوارزمی ہے، مؤخر الذکر کا بتانی، اور یہ دونوں ہی مسلمان تھے۔ ٹھیک اسی طرح نظریۂ کشش کو کوئی انگریزی علم نہیں کہہ سکتا، اگرچہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا موجد انگریز تھا[۵۵]۔ یہ بڑے بڑے علمی کام نوعِ انسانی کی مشترک میراث ہیں۔

"اسی طرح اگر مسلمان (جیسا کہ ان پر واجب ہے) صنعتی علوم وفنون کے نئے ذرائع اپناتے ہیں تو وہ ایسا صرف ارتقا و ترقی کی فطری خواہش اور جذبے سے کرتے ہیں، دوسروں کے تجربات اور معلومات سے فائدہ اٹھانے کی فطری خواہش اور جذبہ۔ لیکن اگر وہ (اور ان کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہے[۵۶]) مغربی زندگی کی اشکال، آداب، عادات اور مغرب کے اجتماعی تصورات کو اپناتے ہیں تو اس سے ان کو ذرہ برابر بھی فائدہ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ یورپ ان کو اس میدان میں جو دے سکے گا وہ اس سے بہتر نہیں ہوگا جو خود ان کی ثقافت اور ان کے دین نے ان کو عطا کیا ہے۔

"اگر مسلمان ذرا ہمت بلند کریں اور حوصلے سے کام لیں اور ترقی کو ایک ذریعے اور وسیلے کی حیثیت سے اپنائیں تو وہ اس طرح نہ صرف اپنی باطنی حریت کی حفاظت کرسکیں گے بلکہ شاید یورپ کے انسان کو زندگی کے گم شدہ لطف کا راز بھی بتا سکیں گے"[۵۷]

---

۵۵ نظریۂ کشش یا قانونِ تجاذب (GRAVITATION) کے اصل موجد مسلمان تھے۔ حتیٰ کہ وہ عالم گیر قانونِ تجاذب سے بھی واقف تھے۔ یہ نظریات مسلم دور میں اتنے عام تھے کہ علما اور صوفیا بھی ان سے واقف تھے، جیسا کہ مثنوی مولانائے روم کے حسبِ ذیل اشعار دلالت کرتے ہیں:

جملہ اجزائے جہاں زاں حکم بیش ۔۔۔ جفت جفت و عاشقان جفت خویش

ہر دو جزوے بہ عالم جفت خواہ ۔۔۔ راست ہم چو کہربا و برگ کاہ

آسمان گوید زمیں را مرحبا ۔۔۔ با توام چون آہن آہن ربا

یعنی اس کائنات کا ہر ذرہ دوسرے ذرے کو اس طرح کھینچتا ہے جس طرح کہربا گھاس اور تنکوں کو کھینچتا ہے آسمان اور زمین ایک دوسرے کو لوہے اور مقناطیس کی طرح کھینچتے ہیں۔

(جدید معلوماتِ سائنس، حصہ اول، از آفتاب حسن، ص ۳۷)

۵۶ قوسین کی یہ عبارتیں کتاب کے اردو ترجمے میں اسی طرح مذکور ہیں جو شاید مترجم کا اضافہ ہے۔

۵۷ THE ROAD TO MECCA کا اردو ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" از محمد الحسنی، ص ۱۸۷ - ۱۸۹، لکھنؤ، ۱۹۶۱ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ اقبال اپنے خطبات میں تحریر فرماتے ہیں :

" علوم و فنون ، فلسفہ اور سائنس میں مسلمان مغرب سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ یہ محض مادی ترقی ہے اور مسلمانوں کی روحانیت کا تفوق ابھی تک قائم ہے۔ قرآن مادی اور غیر مادی کی تقسیم کا قائل نہیں ۔ تسخیر فطرت آدم کی صفت ، اس کا وظیفۂ حیات اور اس کا مقصود زندگی ہے۔ تسخیرِ فطرت سے مغرب نے غیر معمولی ترقی حاصل کرلی ہے ۔ جن قوموں نے ان میں حصہ نہیں لیا وہ مغلوب اور کمزور ہوگئی ہیں ۔ علوم و فنون کی ترقی اور تسخیرِ فطرت نے نئے زوایائے نگاہ پیدا کر دیے ہیں ، مسائل حیات کی صورت بدل گئی ، قدیم تصورات کو نئے سانچوں میں ڈھالنا ضروری ہوگیا ہے ۔"[۵۵]

نیز وہ فرماتے ہیں :

" قرآنِ حکیم کا مقصد خدا اور کائنات سے انسان کے رابطے کا ایک گہرا شعور پیدا کرنا ہے ۔ قرآن کا نظریۂ حیات حکمائے مغرب کے لیے بھی کوئی فرسودہ چیز نہیں ۔ گوئٹے جیسا حکیم بالغ نظر اپنے ندیم ایکرمن سے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ تعلیم کبھی ناکام نہیں رہ سکتی ۔ کوئی نظامِ فکر اور کوئی انسان اس سے آگے نہیں نکل سکتا ۔ اسلام کا اصل مسئلہ دین اور دنیا ، مذہبی عقائد اور تہذیب و تمدن کا رابطہ واضح کرنا تھا ۔"[۵۶]

" قرآن کریم کہتا ہے کہ آدم کو جو اشیا کا علم عطا کیا گیا تھا ، اس کی بدولت اس کو ملائکہ پر فوقیت حاصل ہوئی ، جس کے یہ معنی ہیں کہ کائنات کی ناظم قوتیں علم اشیا سے مطیع ہوتی اور انسان کے سامنے سر بسجود ہوتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ تمام قرآن مطالعۂ فطرت اور مشاہدۂ موجودات کی ترغیب سے لبریز ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اور طبیعی علوم میں کبھی تصادم نہیں ہوسکتا ۔ ۔ ۔ نہ یونانی حکما کے ہاں مادی عالم کوئی قابلِ غور چیز ہے اور نہ رہبانی مذاہب اس کو قابلِ اعتنا سمجھتے تھے ۔ اسلام اس قدیم فلسفے اور اس قدیم ادیان کے خلاف ایک کامیاب بغاوت تھا ۔ ۔ ۔ اکثر غیر اسلامی فلسفوں میں یہ عقیدہ

---

۵۵ فکرِ اقبال از خلیفہ عبدالحکیم ، ص ۴۵۸ ۔ ۴۵۹ ۔ علی گڑھ ، ۱۹۷۷ء

۵۶ ایضاً ، ص ۴۵۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تم ہو گیا تھا کہ متغیر عالم غیر حقیقی عالم ہے۔ قرآن نے کہا ہرگز نہیں۔ تغیرات کا عالم بھی حقیقی عالم ہے ر باطل نہیں۔ یہ بھی حق ہی کا پہلو ہے جو اس کی بصیرت پیدا نہ کرے گا وہ عالم روحانی میں بھی بے بصر ہے گا۔ قدیم مذاہب اور تہذیبیں اسی لیے ناکام رہیں اور تکمیلِ انسانیت میں حاجب ہوئیں کہ انھوں نے باطن کو ظاہر سے الگ کے تمام تر توجہ باطن پر مبذول کر دی جن فلسفوں میں یہ نظریۂ حیات تھا وہ بھی یک طرفہ ہونے کی وجہ سے زندگی کی کوئی لی بخش تعبیر نہ کر سکے۔ ایسے ادیان اور فلسفوں پر کوئی پائیدار تہذیب نہیں ہو سکتی ... مادی قوتوں پر غلبہ حاصل کرنا فی نفسہ مود نہیں۔ اس کی غرض یہ ہے کہ انسان روحانی زندگی کے مقصدِ اشرف کے حصول میں ترقی کا قدم اٹھا سکے۔"[56]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:

"مغرب کے ناقابلِ انکار علمی و صنعتی تفوق کو سامنے رکھ کر، جس سے آنکھیں بند کر لینا نہ عقل کا تقاضا ہے، نہ مذہب کی تعلیم، اور نہ عملاً ممکن، عالمِ اسلام کے سامنے صرف دو راستے رہ جاتے ہیں، ایک تو یہ کہ س سے مسحور ہو کر اس کے پورے فلسفۂ زندگی، اس کے تصورِ کائنات، اس کے مابعد الطبیعاتی عقائد و تصورات، اس کے عمرانی و اجتماعی نظریات، اس کے اخلاقی نقطۂ نظر اور اس کے مسلکِ زندگی کو جوں کا توں قبول کر لیا جائے اور اپنی نظریاتی ہستی کو اس کے سانچے میں یکسر ڈھال دینے کی کوشش کی جائے۔ یہ اس حقیقت سے قطع نظر کہ یہ ایک مکمل اور ہمہ گیر ارتداد اور روحانی و ذہنی خودکشی کے مرادف ہوگا اور اس انسانیت کے ساتھ غداری اور بے وفائی جس کی آخری آس نبی خاتم کی اسی اُمت سے لگی ہوئی تھی، ایک ایسی غیر ضروری محنت اور سعی لاحاصل ہے، جس کا نتیجہ طویل و خونریز ذہنی کش مکش، روحانی بے چینی، انسانی طاقتوں کے ضیاع اور اضاعت وقت کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ایک ایسی بنی بنائی مستحکم عمارت کی تخریب ہے جس کے ملبے پر دوسری عمارت تعمیر کرنے کے لیے نہ موادِ خام موجود ہے، نہ تعمیری صلاحیتیں، نہ آب و ہوا اور ماحول سے مناسبت، نہ ماضی سے ارتباط۔ عالمِ اسلام کے جن جن گوشوں اور جن اسلامی ملکوں میں یہ کوشش کی گئی ناکام رہی، اور جب بھی اس مصنوعی اور غیر طبیعی اقتدار کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور عوام کو اپنی پسند اور ناپسند کے اظہار کا موقع ملا، انھوں نے فوراً اس جوئے

---

۵۶ ایضاً، ص ۲۶۱-۲۶۲ (ملخص)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو اتار پھینکا، جو نہ ان کے جسم پر قطع ہوئی تھی اور نہ ان کے مزاج کے مطابق تھی۔ آج ترکی میں یہی نظر آ رہا ہے اور مصر و شام میں بھی عنقریب یہی پیش آنے والا ہے۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ مغرب سے علم و صنعت، ٹکنالوجی اور سائنس اور علوم و تحقیقات میں جن کا تعلق تجربے، حقائق و واقعات اور انسانی محنت و کاوش پر ہے، فراخ دلی کے ساتھ استفادہ کیا جائے، پھر ان کو ان مقاصد کے لیے اپنی خداداد ذہانت اور اجتہاد کے ساتھ ان اعلیٰ مقاصد کا تابع اور خادم بنایا جائے جو آخری نبوت اور آخری صحیفے نے ان کو عطا کیے اور جن کی وجہ سے ان کو خیر امت اور آخری امت کا لقب ملا ہے۔ وسائل اور مقاصد کا یہ خوش گوار امتزاج جس سے سردست مغرب بھی محروم ہے اور مشرق بھی کہ مغرب تنہا قاہر وسائل کا سرمایہ دار ہے اور صالح مقاصد میں محض تہی دامن۔ اور مشرق (اسلامی) صالح مقاصد کا اجارہ دار ہے اور موثر وسائل سے یکسر محروم۔ مغرب سب کچھ کر سکتا ہے لیکن کرنا نہیں چاہتا اور صحیح الفاظ میں کرنا نہیں جانتا۔ اسلامی مشرق کرنا سب کچھ چاہتا ہے لیکن کر کچھ نہیں سکتا۔ یہ صحت مند اور صالح امتزاج دنیا کی قسمت بدل سکتا ہے اور اس کو خودکشی و خودسوزی کے راستے سے ہٹا کر فلاح دارین اور سعادت ابدی کے راستے پر ڈال سکتا ہے۔ یہ کارنامہ وہی امت انجام دے سکتی ہے جو آخری پیغمبر کی جانشین اور اس کی تعلیمات کی حامل و امین ہے۔ اس بنا پر عالم اسلام کا حقیقی نعرہ جس سے اس کے دشت و جبل گونجنے چاہییں یہ ہے:

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ — معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز[۵۸]

پھر موصوف آگے مزید فرماتے ہیں:

"مغربی تہذیب کو پورے طور پر گھن لگ چکا ہے۔ وہ اب محض اپنی صلاحیت اور زندگی کے استحقاق کی بنا پر نہیں جی رہی ہے بلکہ اس لیے کہ بدقسمتی سے کوئی تہذیب اس کی جگہ لینے کے لیے تیار نہیں۔ اس وقت جتنی تہذیبیں یا قیادتیں ہیں یا مغربی تہذیب کی لکیر کی فقیر اور اس کی ایک روکھی

---

۵۸ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص ۲۸۹ - ۲۹۱، لکھنؤ، ۱۹۷۰ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھیکی تصویر ہیں یا اتنی کمزور اور شکست خوردہ ہیں کہ اس سے آنکھیں نہیں ملا سکتیں۔ اب اگر اسلامی ممالک اور عالم اسلام مجموعی طور پر اس خلا کو پُر کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے جو مغربی تہذیب کے خاتمے سے عالم اسلامی میں پیدا ہوگا تو اس کو دنیا کی امامت کا دوبارہ منصب تفویض کیا جا سکتا ہے جو سنت اللہ کے مطابق ایک جری و قوی اور توانا قوم ملت یا قیادت کے سپرد کیا جاتا رہا ہے۔"[59]

تمدن و ثقافت کو مذہب سے کس طرح ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟

"دین ایک ابدی حقیقت ہے جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ لیکن علم ایک پھلنے پھولنے والا درخت ہے، جس کا نشوونما برابر جاری رہے گا۔"[60]

ہم کو دین اور اس کے بنیادی اصولوں پر پوری طرح ثابت قدم رہتے ہوئے صرف علم جدید سے استفادہ کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ جیسا کہ واضح کیا جا چکا تجرباتی علوم کسی مخصوص قوم کی میراث نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کا مشترکہ سرمایہ ہیں، جن سے فائدہ نہ اٹھانا قوموں کی محرومی و بدنصیبی بلکہ ان کے ادبار کی علامت ہے۔ یعنی جو قومیں علم جدید سے آراستہ ہوتی ہیں، لازمی طور پر ان کا غلبہ و استیلا اس علم سے عاری یا غیر ترقی یافتہ قوموں پر قائم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ علم جدید لازمی طور پر تمدن جدید کو جنم دیتا ہے، جو تجرباتی علوم کی ترقی کا منطقی اور راست نتیجہ ہوتا ہے۔ لہٰذا جو قوم علم جدید میں پیچھے رہ جائے وہ گویا تمدن جدید میں بھی پیچھے ہو جائے گی، اور جو قوم علم جدید میں ترقی یافتہ قوموں کی برابری کیے بغیر محض تمدن جدید میں ترقی یافتہ قوموں کی نقالی کرنے لگے وہ ذہنی اعتبار سے مرعوب اور ترقی یافتہ قوموں کی ذہنی غلامی اور اس کے سحر میں مبتلا رہے گی اور اس کے تمام تہذیبی و ثقافتی اقدار کو من و عن قبول کر لے گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آج خود ہماری قوم و ملت کے بہت سے اصحاب اور نوجوان اس خطرناک قسم کے ذہنی ارتداد سے —— شعوری یا غیر شعوری طور پر —— دوچار ہیں، جن پر مغربی تہذیب پوری طرح حملہ آور ہو چکی ہے، اور آج ہمارا

---

[59] مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص ۲۹۳

[60] ایضاً، ص ۸۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وئی ملک، کوئی شہر اور کوئی قریہ تک مغربی تہذیب کے اس غلبے و استیلا سے محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔ لہٰذا اس مسئلے کا بہترین حل یہ ہے کہ ہم کسی کے تمدن و ثقافت کی نقالی کرنے کی بجائے علم جدید سے آراستہ و پیراستہ ہو کر اپنی راہ خود بنائیں اور ایک بالکل نئے تمدن کو پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے دین و شریعت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو۔ ہم کو کسی سے تہذیب و ثقافت عاریتاً لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم خود ایک برتر اور ہمہ گیر تہذیب کے مالک ہیں۔ وہ تہذیب جو آغازِ اسلام کی دو عظیم الشان تہذیبوں — ایرانی تہذیب اور رومی تہذیب — سے متصادم ہو کر معرکہ جیت چکی ہے اور چنگیزیوں اور تاتاریوں جیسی اقوام تک کو اپنی تہذیبی آغوش میں لے کر اپنی عظمت کا لوہا منوا چکی ہے۔ چنانچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس سلسلے میں ایک بہترین مثال دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

" پہلا تجربہ وہ تھا جو پہلی اور دوسری صدی کے اسلامی معاشرے کو پیش آیا تھا۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ اسلامی معاشرہ طاقت ور، تازہ دم اور زندگی اور ترقی کی صلاحیتوں سے بھرپور تھا۔ اس کی حیثیت فاتح اور غالب طاقت کی تھی۔ اس کے بالمقابل دنیا کی دو قدیم عظیم تہذیبیں تھیں۔ ایک مغرب کی رومی و یونانی تہذیب، دوسری مشرق کی ایرانی تہذیب۔ دونوں تہذیبیں قدیم دنیا کے علوم و فنون، ثقافت و ادب، فلسفیانہ نظاموں کے ذخیرے اور تمدن و معاشرت کے ترقی یافتہ طریقوں سے مالا مال تھیں۔ اسلامی معاشرے نے جو ہر طرح کے احساس کہتری سے محفوظ اور خود شناسی و خود اعتمادی کی دولت سے بھرپور تھا بغیر کسی ذہنی غلامی اور مرعوبیت کے اپنی ضرورت اور اپنے حالات کے مطابق ان ذخیروں سے استفادہ کیا۔ جس چیز کو مناسب سمجھا اس کو بجنسہٖ اخذ کر لیا اور جس چیز کو نامناسب سمجھا اس کو پہلے اپنے سانچے میں ڈھالا پھر اس کو اپنی صحیح جگہ فٹ کر لیا۔ آزاد اور غالب ہونے کی بنا پر یہ استفادہ اور اقتباس اس معاشرے کی روح اور اس کے اخلاقی رجحان پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔

دوسرا تجربہ وہ تھا جو اس اسلامی معاشرے کو ساتویں صدی میں اس وقت پیش آیا جب تاتاریوں نے عالم اسلامی کے مرکزی حصے پر قبضہ کر لیا اور مسلمان سیاسی طور پر ان کے مفتوح اور زیرنگیں ہو گئے۔ اس وقت اسلامی معاشرے کو جس فاتح سے سابقہ پڑا وہ تہذیب و تمدن، علم و فن، قانون و دستور میں بالکل فرومایہ اور تہی دست تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی تہذیب تھی، نہ زندگی کا کوئی فلسفہ۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفتوح اسلامی معاشرے کے سامنے فاتح کی تہذیب، معاشرت، فلسفہ حیات اور افکار و اقدار سے متاثر و مستفید ہونے کا کوئی حقیقی سوال نہیں تھا۔ اس کے برخلاف فاتح قوم روز بروز اپنی مفتوح اقوام سے متاثر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ بتدریج اپنی مفتوح اقوام کی تہذیب، معاشرت، علوم و فنون، اس کے ترقی یافتہ طریقۂ زندگی اور اس کے اعلیٰ دینی عقائد اور خیالات سے متاثر ہوتی چلی گئی۔ بالآخر اس نے اپنی مفتوح اقوام کا دین اور ان کی تہذیب پورے طور پر قبول کر لی اور ان کے سانچے میں ڈھل کر حرم کی پاسبان اور اسلام کی پُرجوش علم بردار اور محافظ بن گئی۔"[۱۱]

اصل میں تہذیبی شکست یا خود سپردگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ یا تو تاتاریوں کی کوئی قوم وحشی یا تہذیبی اعتبار سے مفلس و قلاش ہو یا پھر خود اعتمادی و خود شناسی کے بجائے خواہ مخواہ مرعوبیت اور احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے۔ مگر اسلام جیسی عظیم الشان تہذیب اور اس کے اعلیٰ اقدار کو دیکھتے ہوئے ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی باہوش اور صحیح العقیدہ مسلمان اسلامی تہذیب کو استخفاف کی نظروں سے دیکھے گا اور محض ظاہری چمک دمک کی بنا پر اپنی تہذیب کو خیرباد کہہ کر مغربی تہذیب اختیار کر لے گا۔

غرض آج ہم کو اپنے تمام تمدنی و اجتماعی امور و مسائل میں وہی رویہ اور طرزِ فکر اختیار کرنا ہوگا جس کی پہلی اور دوسری صدی ہجری میں ہمارے آبا و اجداد نے رومی اور ایرانی تہذیب و تمدن کے بارے میں اپنا کر نہ صرف اپنے دینی و ملّی شعائر اور اپنے اقدارِ حیات کی حفاظت کی بلکہ ایک عظیم الشان تمدن کی داغ بیل ڈال کر ہمارے لیے ایک نمونہ اور مثال بھی قائم کر دی ہے۔ ہم کو ہر حال میں دین و شریعت کے حدود و ضوابط میں رہتے ہوئے "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے حکیمانہ اصول کے مطابق موجودہ تہذیبی معرکہ جیتنا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا اسلام تمدن کی ترقی میں مانع نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ یہ ہماری اپنی لاعلمی اور کم ہمتی ہے جو اس میدان میں ہم پیچھے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے تصورِ فہم اور تصویرِ

---

[۱۱] ایضاً، ص ۴۹ - ۵۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عمل کا ذمہ دار اسلام یا اسلامی تہذیب کو قرار دینا صحیح کیسے ہو سکتا ہے؟

اصل میں دینِ ابدی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف انہی امور میں مفصل ہدایات دیتا ہے جن کو انسان اپنی عقل و تجربے سے معلوم نہیں کر سکتا، انہی کا نام شرعی احکام یا "اوامر یا نواہی کا مجموعہ" ہے۔ ان اُمور میں ایک سرمو کی بھی کسی دور میں تبدیلی نہیں ہو سکتی[۱۲] اس کے برعکس وہ امور جن کو انسان خود اپنی عقل اور تجربے سے معلوم کر سکتا ہے تو ان میں چند امور و ضوابط کے اندر انسان کو مکمل آزادی ہوتی ہے۔ حدیث شریف "انتم اعلم بامور دنیاکم" (تم اپنے دنیوی معاملات کو خود جانتے ہو) میں اسی طرف اشارہ ہے اور جدید سے جدید تر تمام علوم و فنون اسی ذیل میں آسکتے ہیں۔

غرض دینِ اسلام میں ہر چیز کا بیان واضح، اس کے حدود معین اور ہر مسئلے سے متعلق تشفی بخش ہدایتیں مذکور ہیں اور کوئی بھی چیز مشتبہ یا مشکوک نہیں ہے۔

اسلامی تہذیب کی صلاحیت و کاملیت

بین الاقوامی شہرت کے مالک مغربی فاضل محمد اسد نے اپنی مشہور کتاب "اسلام ایٹ دی کراس روڈس" میں اسلام اور اس کی تہذیبی صلاحیت و کاملیت اور موجودہ دور میں اس کے رہبرانہ کردار ادا کرنے کی استعداد نیز مسیحیت کی ناکامیوں اور موجودہ مغربی تمدن کے ارتقا کے اسباب اور اس کی غیر صالحیت وغیرہ بہت سے مسائل پر تبصرہ اور اظہارِ خیال کرتے ہوئے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ موصوف کے سلیم الطبع اور صائب الرائے ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ اس موقع پر کتاب مذکور سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

"اسلام مجھے ایک مکمل تعمیری ڈھانچہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے تمام حصے ایسی خوش اسلوبی سے مربوط ہیں کہ ایک دوسرے کے لاحقے اور مددگار معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی جز بے کار نہیں ہے۔ کوئی

---

[۱۲] سوائے ان جدید مسائل کے جو معاشرت و تمدن کی ترقی کی بنا پر پیش آتے ہیں، ان نئے مسائل کو شرعی ضوابط کے تحت حل کرنے کی تفصیل اور ان کا طریق کار اصولِ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ ان شرعی ضوابط کے تحت قیامت تک پیش آنے والے تمام نئے نئے معاشرتی و اجتماعی مسائل کا حل نکالا جا سکتا، اسی کا نام اصطلاح میں "فقہِ اسلامی" ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امی نہیں ہے، اور نتیجہ یہ کہ بالکل متوازن اور قطعی ٹھوس ترکیب ہے، غالباً اس احساس نے مجھ پر سب سے
یدہ اثر کیا کہ اسلام کی تعلیمات اور نظریات میں ہر چیز اپنی جگہ پر موزوں ہے۔[۱۳]

" اس کے مطالعے اور مقابلے نے مجھ میں یہ اعتقاد راسخ کر دیا کہ اسلام بطور ایک روحانی اور سماجی
ظہر کے، باوجود مسلمانوں کی خامیوں سے پیدا کی ہوئی کمزوریوں کے، آج بھی ایک ایسی محرک قوت ہے جیسی
رع انسانی نے کبھی حاصل نہیں کی۔"[۱۴]

" ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام جو دوسرے مذاہب کے برخلاف محض ایک روحانی ذہنیت نہیں ہے
ۃ مختلف تہذیبی ماحول سے سمجھوتہ کر لے، بلکہ تمدن کا ایک خود کفیل محور ہے اور ایک ایسا سماجی نظام جس
کے حدود اربعہ واضح ہیں۔ جب کوئی اجنبی تمدن اپنا سایہ ہم پر ڈالتا ہے اور ہمارے تہذیبی نظام میں کچھ
تبدیلیاں پیدا کرتا ہے جیسا کہ آج ہو رہا ہے تو ہمیں لازمی طور پر اپنے ذہن میں یہ تمیز کر لینا ہوتا ہے کہ آیا
یہ اجنبی اثر خود ہمارے تہذیبی امکانات کے ساتھ ساتھ چلتا ہے یا اس کے لیے تباہ کن ہے؟ آیا
اسلامی تمدن کے جسم میں وہ طاقت پیدا کرنے والا ہے یا اس کے لیے زہر کا اثر رکھتا ہے؟[۱۵]

" تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی اس کے امکان کی شکل ہے کہ انسان بغیر ایک لمحے کے لیے بھی روحانی
راستے سے الگ ہوئے دنیوی زندگی کو پوری مسرت کے ساتھ گزار سکتا ہے۔ مسیحی تصور سے یہ کتنا مختلف
ہے! مسیحی عقیدے کے بموجب آدم و حوا سے جو گناہ ہوا اس کی پاداش کا ترکہ نسلِ انسانی کو ملا ہے
جس سے وہ لڑکھڑاتی ہے اور کم از کم اس عقیدہ کے نظریہ سے ساری زندگی ایک غموں کی تاریک گھاٹی ہے۔[۱۶]

" لیکن اگرچہ زندگی کی جو مغموم صورت مسیحیت میں بیان کی گئی ہے اس سے اسلام کو اتفاق نہیں ہے
تاہم اس کی یہ تعلیم ضرور ہے کہ دنیاوی زندگی کو مبالغہ آمیز اہمیت نہ دے جیسا کہ آج کل مغربی تہذیب
میں ہو رہا ہے، مسیحی نقطۂ نظر یہ ہے کہ " دنیاوی زندگی بُرا کاروبار ہے۔"[۱۷]

---

[۱۳] کتاب مذکور کا اردو ترجمہ "اسلام دوراہے پر" از رحم علی الہاشمی، ص ۸-۹، دہلی، ۱۹۲۸ء

[۱۴] ایضاً، ص ۹

[۱۵] ایضاً، ص ۱۲-۱۳

[۱۶] ایضاً، ص ۲۲

[۱۷] ایضاً، ص ۲۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"موجودہ مغربی تمدن جن زبردست سائنسی اور مادی ترقیوں میں سب سے آگے بڑھا ہوا ہے اس میں مسیحیت کا بہت ہی کم دخل ہے۔ دراصل یہ ترقیاں اس بنا پر ہوئیں کہ مسیحی کلیسا اور ان کے نقطہ نظر کے خلاف مدت العمر جنگ جاری رہی —— طویل صدیوں تک یورپ کی روح پر اس مذہبی نظام کا جابرانہ تسلط رہا جو زندگی اور فطرت کی تحقیر پر مبنی تھا۔ ترک دنیا کی تحریک جو اناجیل میں شروع سے آخر تک کارفرما ہے، ظلم کو خاموشی سے سہنا، جنسیت کا اس لیے انکار کہ جنت سے آدم و حوا کے ہبوط پہ مبنی ہے، گناہ کا ورثہ، مسیح کی صلیب سے اس کا کفارہ، ان سب تصورات سے حیاتِ انسانی کی تعبیر ایک مثبت منزل کی حیثیت سے نہیں ہوتی، بلکہ ایک ناگزیر مصیبت کی حیثیت سے اور ایک ایسی تعلیمی رکاوٹ کی حیثیت سے جو روحانی ارتقا کی راہ میں حائل ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیاوی معلومات اور دنیوی زندگی کو فروغ دینے کی کوششوں کے یہ عقیدہ موافق نہیں ہے، اور دراصل ایک طویل مدت تک یورپ کی ذہانت حیاتِ انسانی کے متعلق اس منحوس تصور سے دبی رہی"[۱۸]

موصوف موجودہ مغربی تمدن کے بے دین اور خدا بیزار ہونے کے دو بنیادی اسباب کا ذکر کرتے تحریر فرماتے ہیں: "پہلا سبب تو رومن تہذیب کا ورثہ ہے جو انسانی زندگی اور اس کی اندرونی قدروں کے متعلق قطعاً مادیت کا ہے۔ اور دوسرا سبب مسیحیت کی دنیا کی تحقیر اور انسان کی قدرتی خواہشوں اور جائز کوششوں کو دبانے کے خلاف انسانی فطرت کی بغاوت ہے۔"[۱۹]

---

۱۸ ایضاً، ص ۳۵

۱۹ ایضاً، ص ۳۹

© rasailojaraid.com